پچیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 16 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (75:16)۔ سابقہ جمعہ کو چونکہ خصوصی درس تھا اس لیے اس سے پہلے جمعہ میں، جہاں آیات ختم ہوئی تھیں، ممکن ہے وہ آپ کے ذہن میں نہ ہوں، اُن سے اس درس کا آغاز کر رہا ہوں۔ اُن آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے اس کا اعمالنامہ کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی خارج سے لکھی ہوئی نوشت نہیں، دستاویز نہیں، خود انسان کے اپنے نفس کے اوپر منقوش اعمال ہیں۔ سمجھانے کے لیے یہ کہا گیا کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، ظہورِ نتائج کے وقت اس کو کھول دیا جاتا ہے، کوئی دوسرا پڑھنے والا نہیں ہوتا، اسی سے کہا جاتا ہے کہ خود آپ اپنے اعمالنامہ کو پڑھ۔ اور خود ہی اس پر شہادت دے کہ وہ صحیح ہے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اسی سے متعلق آیات سابقہ درسِ خصوصی سے پیوست درس میں، ہمارے سامنے آئی تھیں۔

نزولِ وحی کے سلسلہ میں موجودہ تفاسیر

عزیزانِ من! اب اگلی چار آیات ایسی ہیں جو میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں تدبر کا خاص موقعہ ہوتا ہے۔ یہ چار ایسی ہی آیات ہیں کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ o اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ [1] (75:16-19)۔ اب ان آیات کے متعلق جو قدیم سے مفہوم چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ جبریل امین وحی لاتے تھے' رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ پڑھتے تھے تو آپ اس کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی سے' تیزی تیزی سے' خود پڑھتے چلے جاتے تھے' اس جلدی وتیزی سے پھر کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ ادھر جبریل پڑھتے تھے' اُدھر آپ ﷺ اس کے ساتھ دہراتے تھے اور اس لیے دہراتے تھے کہ کہیں بعد میں کوئی لفظ رہ نہ جائے تو اس پہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ تمہیں جلدی جلدی زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ جبریل کہتا ہے اس کو اطمینان سے سنتے جاؤ۔ یہ جو تمہیں خدشہ ہے کہ بعد میں بھول جاؤ گے اور کچھ رہ جائے گا تو سن رکھو کہ نہیں' ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم یہ کریں گے کہ آپ کو یہ ساری وحی اسی طرح سے یاد ہو جائے' اسی طرح سے پھر آپ اس کو پڑھ لیں۔ یہ مفہوم ان چار آیتوں کا بیان کیا جاتا ہے۔

وحی کے سلسلے میں قابل غور نکات برائے تقاضائے ربطِ مضمون

عزیزانِ من! تدبر کے اعتبار سے' میرے نقطۂ نگاہ سے' میری بصیرتِ قرآنی کی رو سے' یہ مفہوم اس لیے قابلِ فہم نہیں کہ اس سے وحی کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ جبریل امین کا اس طرح سے ان الفاظ کا پڑھنا' رسول اللہ ﷺ کا سننا' پھر اس کا دہرانا' قرآنِ کریم کے تصورِ وحی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ جبریل وحی کو قلبِ محمدی ﷺ پر نازل کیا کرتے تھے بلکہ وہاں تو ہے کہ ہم وحی القاء کرتے تھے اور نزولِ وحی کی رو سے یہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے یہ کچھ اور حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ وحی کا قلب پہ نازل ہونا ہے اور اس کے

---

[1] آیات 16 تا 19 کو اگر سابقہ آیات کے ساتھ مسلسل لیا جائے تو ان کا مفہوم یہ ہوگا: ''اس قسم کی بہانہ سازی کرنے والے سے کہہ دیا جائے گا کہ قینچی کی طرح زبان چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو چاہتا ہے کہ اس تیز کلامی سے معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ اس طرح ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ کام خود ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کو اکٹھا کیا جائے اور پھر انہیں نہایت حفاظت میں رکھا جائے۔ سو (اے انسان!) جب ہم نے (تیرے اعمال کو) اس طرح جمع وثبت کر رکھا ہے تو تجھے اس طرح جمع شدہ کے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ یعنی جس طرف تمہارے اعمال کے نتائج لے جائیں تمہیں اسی طرف جانا ہوگا۔ اس طرح ہم تمہارے اعمال کے نتائج کو ظاہر کر کے تمہارے سامنے لے آئیں گے۔'' (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ آیت 16 سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے تو ان آیات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا:

''اے رسولؐ! تم کسی معاملے کے متعلق عملی قدم اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس وقت تک انتظار کرو جب تک اس معاملہ کے متعلق پورا پورا پروگرام بذریعہ وحی نہ دے دیا جائے (20:114)۔ اگرچہ یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا ہے لیکن تمہیں اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔ تمہارے ذمے اس کے احکام وقوانین کا اتباع کرنا ہے۔ اتباع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آ جائیں۔ اس کا ذمہ بھی ہم نے خود ہی لے رکھا ہے۔ ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس

طرح پوری پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کو سمجھنے کا طریقہ" (پرویز: مفہوم القرآن' طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' سال اشاعت درج نہیں' ص ص۔1389-1388' فٹ نوٹ نمبر 2)

برعکس جبریل امین کا اس طرح سے پڑھ کر سنانا اور اس کیوجہ سے رسول اللہ ﷺ کا اسے دہراتے چلے جانا کہ کہیں اس میں سے کچھ رہ نہ جائے یعنی کچھ تھوڑا سا یہ خدشہ ہونا کہ کہیں کچھ رہ نہ جائے' قرآنِ کریم کی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ یہ خدا کی یقین دہانی ہے کہ نہیں' ایسا نہیں ہوگا' آپ ﷺ نہیں بھولیں گے' ہم اسے محفوظ کرا دیں گے۔ تو وہ جو قلبِ محمدی ﷺ پر اس کا القاء کرنا ہے' یہ چیز اس تصور کے خلاف جاتی ہے جس میں وحی کا پڑھ کر سنانا' آپ ﷺ کا سننا' آپ ﷺ کا دہرانا' بتایا جاتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ان تفاسیر کی رو سے اس میں اور پہلی آیات کے معنی میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ جو پہلی آیات ہیں وہ یہی آ رہی ہیں کہ ان میں اعمالنامے کا ذکر ہے' اس کے سامنے اسے پیش کرنے کا تذکرہ ہے اور آخری چیز یہ ہے کہ وَ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ❶ (75:15)۔ اسے کہا جائے گا کہ اب تو کتنی باتیں بنا' تمہاری کچھ پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جسے اپنے غلط اعمال کے لیے Justificatory Reason (وجہ جواز) کہتے ہیں وہ تو کتنی ہی بنا اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرے اعمال کیا ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں؟ عزیزانِ من! پیچھے سے یہ بات چلی آ رہی ہے اور ان چار آیتوں (75:16-19) کے بعد پھر آیا ہے کہ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ❷ (75:20) یہ لوگ اس لیے غلط روش پر چلتے ہیں کیونکہ یہ اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی سطح کی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو اپنا مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہیں۔ گویا پیچھے سے بھی وہی مضمون آ رہا ہے اور ان آیات کے بعد بھی وہی مضمون ہے جس کا تسلسل ہے۔ تو ربط کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درمیان کی آیات کا مفہوم اسی مضمون سے متعلق ہو جو پیچھے چلا آ رہا ہے اور جو اس کے بعد آگے چلایا جا رہا ہے۔ جہاں تک قرآن کے معاملے میں جلدی کرنے کا تعلق ہے ایک اور مقام میں بھی یہی بات کہی گئی ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ وہاں' الفاظ کے دہرانے یا جلدی جلدی پڑھنے یا جبریل امین کے ساتھ وحی کے دہراتے چلے جانے کی بات نہیں ہے۔ وہاں کہا ہے کہ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰۤی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ ❸ (20:114)۔

عزیزانِ من! قرآن بتدریج نازل ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ قرآن کا عملی پروگرام دیتے تھے' اس پر عمل پیرا ہوتے تھے' اس کے مطابق عمل کراتے تھے' نظام کی تشکیل کرتے تھے' پروگرام کو آگے بڑھاتے تھے۔ اب یہاں یہ کہا ہے کہ جب تک

---

❶ اس وقت تو اس کی عقل بہانہ ساز اس کے غلط اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی' اور اس طرح' حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس وقت اُس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔

❷ تم جو حیاتِ اُخروی سے اس طرح بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہو۔

❸ قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی معاملہ کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایات نازل نہ ہو جائیں' اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ (۱-۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن کا پورا موضوع وحی کے ذریعے نہ آ جائے' اس سے پہلے اس پر عمل پیرا ہونے یا اس پروگرام کے بجا لانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ وہ موضوع پورا ہو جائے تو پھر اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس میں وحی کے الفاظ کو دہرانے کی بات نہیں ہے۔ ان کو عمل میں لانے کا جو طریق تھا وہ بتایا گیا ہے کہ جب ایک موضوع مکمل ہو جائے' پھر اُسے عمل میں لائیے۔

اِن آیات میں سارا ذکر نامہ اعمال سے متعلق ہے

عزیزانِ من! یہاں جو تفاسیر میں جبریل کے ساتھ وحی کے الفاظ دہرانے کی بات ہے تو میں نے اُس کے بارے میں عرض کیا ہے کہ یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے کم از کم میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ وہ مفہوم نہیں ہے جس کی بات پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔ مفہوم وہی ہے' اسی سے کہا جا رہا ہے جس کے اعمالنامے کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اسے کہا جا رہا ہے کہ یہ ہے تیرا اعمالنامہ۔ یہ ہم کھول کر تمہارے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کو خود پڑھو۔ اس کے بعد دیکھو تم خود اس پر شہادت دو گے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے صحیح ہے۔ اب کہا کہ وَ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (75:15) کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا' باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک متعین چیز ہے جو تمہارے سامنے آئی ہے۔

یہاں میں نے عرض کیا ہے کہ اب یہ جو آیات ہیں آپ انہیں اس تسلسل' اور اس ربط کے ماتحت دیکھیں تو ان کا کچھ مفہوم یوں بنے گا: یہ کہا جا رہا ہے کہ لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ (75:16)۔ اس میں یہ ہے جیسے ہمارے ہاں محاورے میں کہتے ہیں کہ قینچی کی طرح زبان چلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' پہلے یہ ہے کہ یہ باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا' کچھ مفہوم نہیں ہے' کچھ معنی نہیں ہیں' کچھ اثر نہیں ہے' تو نتائج اعمال بدل نہیں سکتا' وہ اس لیے کہ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ہمارے ذمہ تھا کہ ہم اس کو اکٹھا کرتے' اور اس کو محفوظ رکھتے۔ ہم نے اسے محفوظ رکھا ہے اور اب تو تم نے اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ یعنی جس طرف تمہارا وہ اعمالنامہ لے جائے گا تمہیں اس طرف جانا ہے۔ وہ اگر ایسا ہے کہ وہ جہنمی بنانے کا ہے' تو وہ تمہیں جہنم کے راستے کی طرف لے جائے گا' تم اس کے پیچھے پیچھے جہنم کی طرف جاؤ گے۔ وہ جنت کی طرف لے جانے والا ہوگا تو تم اس کے پیچھے پیچھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ اس کی نمود' اس کا ظہور' ہمارے ذمہ ہے اور یہ تمہارے اعمال کی نمود کا زمانہ ہے۔ عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ان آیات کا یہ مفہوم اس ربط کے مطابق ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے اور آگے ہے کہ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (75:20) تم جو حیاتِ اُخروی سے بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات بنائے ہوئے ہو۔ اب یہاں بات ہوئی ہے کہ یہ کچھ دیکھتے بھالتے اس قسم کی غلط روش کیوں اختیار کرتے ہو۔

حیوانی زندگی کا نظریہ حیات

آپ کو یاد ہے کہ قرآن کی تعلیم کا بار بار نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے' اسے اس کے علاوہ ایک اور زندگی بھی دی گئی ہے' جسے عام الفاظ میں انسانی زندگی کہیے' جسے انسانی ذات کی زندگی کہتے ہیں' انسانی Personality (شخصیت' ذات) کی زندگی کہتے ہیں۔ اعمال کا اثر اس پر ہوتا ہے۔ وہی ہے کہ جس نے انسان کی طبعی موت کے بعد آگے چلنا ہے' ظہورِ نتائج اسی کے لیے ہیں۔ جو لوگ اس نظریہ زندگی یا تصورِ حیات کو نہیں مانتے' وہ زندگی کو یہی طبعی زندگی سمجھتے ہیں' زندگی کے تقاضے یہی طبعی تقاضے ہیں' زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ قرآن اسے آخرۃ کے مقابلے میں عاجلہ کہہ کر پکارتا ہے' یعنی پیش پا افتادہ' سامنے پڑا ہوا مفاد ہے اور وہ آخرت ذرا بعد میں آنے والا مفاد ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کا تصورِ حیات یہ ہے کہ وہ جو طبعی زندگی کے' طبعی دنیا کے' پیش پا افتادہ مفاد ہیں انہیں جھپٹ کر لیا جائے۔ اس کی پرواہ نہ کی جائے کہ اس کا اثر انسانی ذات پر کیا پڑتا ہے۔ جس طریقے سے بھی روپیہ یا دولت ہاتھ آتی ہے اکٹھی کر لی جائے' اس کا انجام کیا ہوگا' اس کی پرواہ نہیں۔ وہ یہ کرتے ہیں۔ یہ نظریہ زندگی ہے جس کی رو سے یہ لوگ جائز و ناجائز میں' غلط اور صحیح میں' حق اور باطل میں' تمیز نہیں کرتے۔ جو چیز جس طریق سے حاصل ہوتی ہے' اسے یہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے اعمالنامہ کے جو غلط اعمال کے اندراجات ہیں وہ انہیں جہنم کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں' اسی لیے قرآن میں آیا ہے کہ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ [1] (75:20-21)۔ یہاں قرآن عاجلہ کے مقابلے میں اخرۃ لایا ہے۔ وہ خیال نہیں کرتے کہ ان کی جتنی غلط روشیں ہیں آخرت' عاقبت' انجام کار' مآل کار' مستقبل میں' ان کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ٹھیک ہے' دنیاوی مفادِ عاجلہ بڑی جلدی حاصل ہو جاتے ہیں' محسوس ہوتے ہیں' نظر آ جاتے ہیں' ان کی کشش ہوتی ہے مگر ان کے نتائج اُس وقت غیر محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ذرا گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآن اخرۃ کہتا ہے اور وہ ہے جسے قرآن عاجلۃ کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دو تصورِ حیات' دو نظریاتِ زندگی ہیں۔ [2] اس لحاظ سے آپ انہیں دو قسم کے لوگ کہہ لیجیے۔ جنہوں نے مستقبل کی خوشگواریوں کو' اس دنیا کی زندگی میں' اپنے سامنے رکھا ہوگا تو جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ یہ ظہورِ نتائج کا وقت' مرنے کے بعد' قیامت ہی میں' جا کر نہیں آتا۔ وہ قیامت تو برحق ہے لیکن اس کا سلسلہ یہاں اسی دنیا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جنت اور جہنم یہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔

---

[1] تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو منتہائے حیات قرار دیئے ہوئے ہو اور مستقبل کی زندگی کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ (۱) میکانکی تصورِ حیات اور (۲) قرآنی تصورِ حیات۔

اُخروی زندگی کے لیے مفادِ عاجلہ کی قربانی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ جن کے سامنے آخرت کا بھی تصور تھا' انہوں نے عاجلہ مفاد کو بعض اوقات' خوشگوار مستقبل بنانے کے لیے' قربان کر دیا کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ زندگی بہر حال آگے چلنے والی ہے' اس کا خیال کرنا چاہیے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اعمال کے نتائج ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ❶ (75:22-23)۔ اس آیت میں پہلا ناضرۃ ''ض'' کے ساتھ ہے اور دوسرا ناظرۃ ''ظ'' کے ساتھ ہے۔ یہ عربی زبان ہے۔ کہا کہ اس دن یہ لوگ' جنہوں نے مستقبل پر نگاہ رکھی ہوگی' ان کے چہرے بڑے ہشاش بشاش ہونگے۔

خدا تعالیٰ کے دیدار کا مفہوم

عزیزانِ من! اب اگلی آیت میں یہ چیز ہے کہ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ❷ (75:23) وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قیامت میں خدا کا دیدار ہوگا' وہ سامنے آئے گا اور اس طرح لوگ اسے دیکھیں گے۔ میں اس فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ خدا کا جو تصور قرآن نے دیا ہے' وہ بہر حال محسوس آنکھوں سے دیکھا جانے والا نہیں ہے۔ عام آنکھیں تو ایک طرف رہیں' وہ تو پیغمبر کی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ حضرتِ موسیٰ ◆ نے بھی جب یہ کہا تھا کہ بات تو آپ سنا رہے ہیں' ذرا بے نقاب سامنے بھی تو آیئے' تو جواب دیدیا گیا کہ لَنْ تَرٰىنِىْ (7:143) تو مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ محسوسات سے بلند' ماوراذات ہے: برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ وہ تو اس نے جو اپنی صفات بیان کر دی ہیں' ان سے ذہن میں کچھ ایک تصور قائم ہو سکتا ہے' محسوسات کی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔ بہر حال یہ اگر محسوس معنوں میں لیا جائے کہ وہاں یہ چیز محسوس طور پر سامنے ہوگی تو وہ قرآن کے اس تصور کے خلاف چلی جاتی ہے۔

قرآن نے اُخروی زندگی کو مثالی طور پر بیان کیا ہے

عزیزانِ من! وہاں حیات بعد الممات کی زندگی کیسی ہوگی' اسے ابھی ہم نہیں جان سکتے۔ وہ تو خود ہی قرآن نے مثالی طور پر بیان کی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اگر وہاں قرآن نے باغ کہا ہے تو اس میں اسی قسم کے درخت لگے ہوئے ہونگے' وہ باغ ہوگا اور اس کے نیچے' اگر نہریں جاری ہیں' تو واقعی وہ ندی ہوگی' اسی طرح کے پانی ہونگے اور یہ سب چیزیں ہوں گی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے سمجھانے کے

---

❶ مستقبل کی خوشگواریاں' مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں بہت زیادہ شگفتہ و شاداب ہیں۔ جن لوگوں کو وہ حاصل ہوں گی ان کے چہرے ہشاش بشاش اور تر و تازہ ہوں گے۔ اور وہ اپنے نشوونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ اپنے نشوونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ (ایضاً)

لیے مثالی طور پر یہ کچھ کہا ہے۔ یہ تو دراصل خدا کی کرم گستری' اس کی عنایات' اس کی نوازشات ہوں گی۔ رب سے ربوبیت ہی کیوں نہ مراد لی جائے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر ہے کہ انہیں اس کے سامانِ ربوبیت کی فراوانیاں حاصل ہونگی اور اس سے ان کی زندگی بڑی خوشگوار ہوگی' چہرے بڑے مسکراہٹ سے بھرے ہوئے ہونگے۔ اور ان کے برعکس وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ o تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ❶ (75:24-25) جو دوسرے قسم کے لوگ ہونگے ان کے چہرے بڑے افسردہ' پژمردہ' جسے منہ "بسورے" ہوئے کہتے ہیں' ہوں گے۔ یہ "باسرۃ" اسی "بسورے" سے ہی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہوگی اس لیے کہ انہیں نظر آ رہا ہوگا کہ کمر توڑ دینے والی ایک مصیبت ہے جو اُن پر آن پڑے گی۔ وہ جو اُن کی غلط روش کا انجام ہوگا اس وقت وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے گا۔ یہاں تو یہی صورت ہے کہ انسان اپنی غلط روش کے انجام کو محسوس طور پر اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا' یا اسے دیکھتا نہیں ہے۔ اس وقت وہ سامنے آ جائے گی اور اسے نظر آئے گا کہ ہاں یہ ایک "فاقرۃ" ہے جو بہت بڑی' جسے کمر شکن کہتے ہیں' کمر توڑ دینے والی' ایک مصیبت ہے جو آنے والی ہے۔

یہاں کہا ہے کہ انہیں مستقبل کی زندگی کے متعلق ہرگز شک وشبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور وہ لفظ ہے: كَلَّآ (75:26)۔ اب یہ کہتا ہے کہ یہ آخرت کی زندگی کا' مرنے کے بعد کی زندگی کا' انکار کیے چلے جاتے ہیں حالانکہ انسان کی مرنے کے بعد کی زندگی کی کیفیت کچھ اور ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ o وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ o وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ o وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ❷ (75:26-29)

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ آخری دو تین پاروں کی' یہ جو اس قسم کی آخری سورتیں ہیں' ان کی آیات بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ دو دو لفظ کی آیات ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ بالکل عروج پہ پہنچی ہوئی ہیں۔ جامعیت اور Concentration (ارتکاز) کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک لفظ کے اندر معنی کی دنیا چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب یہ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ ایسا نظر آتا ہے جیسے کچھ شاعری کی بات ہو رہی ہے۔

قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ اسی زندگی میں جب تم آخری لمحات کی ہچکیاں لے رہے ہوتے ہو' جس وقت موت سامنے نظر آ رہی

---

❶ جن لوگوں کو یہ کچھ میسر نہ ہوگا ان کے چہرے افسردہ و پژمردہ ہوں گے' اس لیے کہ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوگا کہ اب وہ مصیبت آنے والی ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت انسان سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتا ہے اور سانس گلے میں اٹک جاتی ہے اور ہر کہنے والا یہی کہتا ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی بن پڑے کر لینا چاہیے (اگر دوا دارو سے فائدہ نہیں ہوتا تو) کسی جھاڑ پھونک والے کو بلا لو شاید وہی اس کی جان بچا لے۔ اس سے مرنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اب اُس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اُس وقت اُس کی اور اُس کے پسماندگان کی سختیاں اور مصیبتیں تو بر تو جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ (ایک پر دوسری

مصیبت چلی آتی ہے۔)(مفہوم القرآن۔پرویز)

ہوتی ہے' اس وقت تمہاری اور تیمارداروں کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کوئی علاج معالجہ تو ایک طرف رہا' وہ توہمات سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ کہتے ہیں اوا کوئی بات نہیں' اگر کسی دوائی سے فائدہ نہیں ہوتا' کسی جھاڑ پھونک والے کو ہی بلالو' کچھ دم درود ہی کرالو' کسی پیر صاحب کو ہی آواز دیدو۔یعنی اس وقت تمہاری مایوسی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ یہ جو ساری دنیائے اسباب میں تم ہر چیز اسباب کی رو سے' سامان کی رو سے' محسوسات کی رو سے' کرتے تھے اس وقت تم توہمات کی دنیا میں چلے جاتے ہو کہ کسی طرح سے یہ بچ جائے' اس کی مصیبت' تکلیف کم ہوجائے۔ وہاں تک تم پہنچ جاتے ہو۔ یہ جو اس وقت تم اس طرح سے انکار پہ انکار کیے چلے جاتے ہو' اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تم بوکھلا اٹھے ہوتے ہو' تمہاری پریشانی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ تم یہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہو اور یہ ہمارا ایسے وقت میں روزمرہ ایسا تجربہ ہے کہ جب کیفیت یہ ہوجائے کہ وہ طبیب بھی مریض سے مایوس ہوکر اٹھ کے چلا جا رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ ''یوں تو خدا کی خدائی برحق ہے' پر ہمیں تو کوئی آس نظر نہیں آتی'' تو پھر اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے: کوئی کہتا ہے کہ صاحب وہاں ایک بھنگڑ خانے کا چوڑا ❶ ہے۔وہ ڈھول بجاتا ہے تو اس سے یہ فائدہ ہوجاتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اوا اونوں ای سدلے۔ ❷ یعنی قرآن کا یہ بات کہنے کا کیا انداز ہے کہ اس وقت عقل اور فکر اور منطق اور فلسفہ اور محسوسات اور دوادارو سب چیزیں تم چھوڑ جاتے ہو اور یہاں تک پہنچ جاتے ہو کہ عام زندگی میں جن چیزوں کا تم مذاق اڑاؤ' اس وقت ان چیزوں کے متعلق بھی کہتے ہو کہ اوا یہ بھی کر کے دیکھ لو' شاید یہی کچھ ہوجائے۔ تمہاری مایوسیوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔اور اُدھر شدت سے تکلیف پر تکلیف جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! ساق کا یہ لفظ عربی زبان میں ہے۔یوں تو اس کے معنی پنڈلی کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ عربی زبان میں ہے کہ جب کوئی شدت کی تکلیف آئے تو اس کے لیے یہ لفظ کہتے ہیں۔پنڈلی کھل جانا' اردو میں بھی ایک محاورہ ہے' اگرچہ اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔یہاں کہا ہے کہ تکلیف پہ تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ❸ (75:30)۔عزیزانِ من! یہاں ''مساق'' کا لفظ آیا ہے یعنی یوں ہے کہ جیسے اس وقت پھر کوئی ہنکائے جا رہا ہو' جیسے کسی بیل کو' کسی مویشی کو' پیچھے سے ہانکتا ہوا چلا جا رہا ہو' کھینچ کے کسی طرف وہ لے جا رہا ہو مگر وہ جانہ رہا ہو اور یہ لے جا رہا ہو۔یعنی یہ عجیب انداز کی بات ایک ہی لفظ میں کہہ دی کہ پھر اس وقت یہ بارگاہِ خداوندی کی طرف ہنکائے جا رہا ہوتا ہے۔یہ وہ چیز تھی جسے یوں کہتے ہیں کہ وہ کیا بات تھی جو اس کی یہ کیفیت ہوگئی؟ اب دو آیات میں آپ غور کیجیے کہ کیا کچھ کیسے کہہ دیا گیا ہے۔

---

❶ بھنگی

❷ اُسے ہی بلالو۔

❶ اُس وقت انسان کو ہر طرف سے ہٹا سمٹا کر عدالت خداوندی کی طرف ہانک کر لایا جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن ۔ پرویز)

عزیزانِ من! ادب میں ایک صنف ہوتی ہے اسے نثر ❶ کہتے ہیں: اِدھر کے ایک لفظ کے مقابل میں سامنے دوسرا لفظ لانا۔ عام طور پر یہ شاعری میں ہوتا ہے۔ عربی زبان کے ادب میں بھی یہ بڑی خصوصیت ہے کیونکہ اس میں تو پوچھیے ہی نہیں کہ کتنے الفاظ ہوتے ہیں مرادفات تو سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ نثر بڑا لطیف ہوتا تھا۔

صدق کے بالمقابل کذب اور صلّٰی کے بالمقابل تولّٰی کا مفہوم

قرآن کی اس آیت کے اندر یہ صنف نثر نظر آ رہی ہے: فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ❷ (75:31)۔ اس کی یہ حالت ایسی کیوں ہوئی اس لیے کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی o وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ❸ (75:31-32) یہاں ''صدق'' کے مقابل میں ''کذب'' آیا ہے۔ اس لیے کہ یہ حقائق کی تصدیق نہیں کرتا تھا۔ یہی ایک بات نہیں ہے کہ کچھ نہ کرے خاموش رہے۔ آگے دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ ''کَذَّبَ'' آ گیا۔ ''صدق'' کے مقابل میں ''کَذَّبَ'' آ گیا۔ تصدیق نہیں کرتا تھا حقائق کی تکذیب کرتا تھا۔ اب یہ دیکھیں کہ یہ دونوں چیزیں ملانے سے مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں ایک دوسرے کی Opposit (متضاد) ہوتی ہیں متخالف ہوتی ہیں جیسے ایک طرف فلا صَدَّقَ اور دوسری طرف ولکن کَذَّبَ آیا ہے یعنی تصدیق نہیں کرتا تھا تکذیب کرتا تھا۔ دوسرا ہے: ولا صلی اور و تولیٰ ۔ اب ''صلی'' کے مخالف ''تولّٰی'' آیا ہے۔ ''تولّٰی'' کا تو مفہوم متعین ہے کہ ہر جگہ منہ موڑ کے چل دینا گریز کی راہیں نکال لینا پیٹھ پھیر کے چل دینا۔ اب اس کے مقابلے میں ''صلّٰی'' ہے۔ اب اس کے لیے ہمارے ہاں جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے وہ ہے کہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ ٹھیک ہے صلوٰۃ بڑی اہم چیز ہے لیکن وہ تو میں اس آیت میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو قرآن کا ادبی اعجاز ہے یہ بات اس کے خلاف چلی جاتی ہے کہ یہ اِدھر ''صلّٰی'' کہتا ہے اور اس کے مقابل ''تولّٰی'' کہتا ہے۔ ''تولّٰی'' کے مقابل کا

---

❶ اصلاح میں اسے ''لف ونشر'' بھی کہتے ہیں۔ لف کے معنی ہیں لپیٹنا اور نشر کے معنی ہیں پھیلانا۔ اصطلاح میں کلام کے اندر دو یا زیادہ باتوں کا ذکر کر کے ان سے تعلق اور مناسبت رکھنے والی اتنی ہی باتوں کا مزید ذکر کرنا ''لف ونشر'' کہلاتا ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) لف ونشر مرتب۔ (۲) لف ونشر غیر مرتب اور (۳) لف ونشر معکوس الترتیب۔ اس آخری صورت کی مثالیں یہ ہیں

ایک سب آگ ایک سب پانی ..... دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں (میر)

اس میں ''آگ'' اور ''پانی'' اس کی مثال ہیں۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے (اقبال)

اس میں ''ابتدا'' اور ''انتہا'' اس کی مثال ہے۔

❷ (ان حقائق کی روشنی میں تم اس شخص سے کہو) جو ہمارے قانونِ مکافات کی تصدیق نہیں کرتا اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔

❸ ہمارے قانونِ مکافات کی تصدیق نہیں کرتا اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا بلکہ اس کی تکذیب کرتا ہے اور اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ (۲-۳

مفہوم القرآن ۔پرویز)

لفظ آنا چاہیے' اس کی ضد کا لفظ آنا چاہیے۔عربی زبان میں یہ جو مادہ [1] ہے' جسے ہم صلوٰۃ کہتے ہیں' اس کے معنی ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے سیدھے راستے پہ چلے جانا۔بنیادی معنی اس کے یہ ہیں۔اسے پھر دہرا دوں' جو کئی دفعہ دہرایا گیا ہے کہ جسے مصلی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ریس کورس میں ایک گھوڑا پہلے نمبر پہ جا رہا ہو' اس کے پیچھے دوسرا گھوڑا اس انداز سے اس کے پیچھے پیچھے جائے کہ اس کی کنوتیاں اس کی پشت کے ساتھ چھوتی ہوئی ہوں یعنی دونوں کے درمیان میں کوئی فاصلہ نہ ہو لیکن جائے یہ اس کے پیچھے اور مسلسل اس کے پیچھے جائے۔اسے عربی میں مصلی کہتے ہیں۔اب ہمارے ہاں تو مصلی کا ترجمہ نماز پڑھنے والا ہوتا ہے۔میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس لفظ کی بنیاد میں چلے جائیے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن کا مفہوم سمجھنے کا طریقہ بار بار دہراؤں۔وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے مادے کے بنیادی معنوں کی طرف جائیے' پھر یہ دیکھیے کہ عرب ان الفاظ کو کن کن معنی میں استعمال کرتے تھے' پھر دیکھیے کہ قرآن میں ان میں سے کونسا لفظ اس آیت کے اندر صحیح بیٹھتا ہے۔یہ آپ کریں گے تو سارا قرآن سمجھ میں آ جائے گا' کوئی دشواری نہیں ہوگی' کہیں تضاد نہیں ہوگا' کہیں تخالف نہیں ہوگا' کہیں ابہام نہیں ہوگا۔اور اگر آپ یہ کچھ نہیں کریں گے تو ایک ایک آیت میں آپ کو ابہام نظر آئے گا۔اب یہاں ہی وہ جو ادب کی اتنی بڑی صنف [2] ہے' اُسے ہی دیکھ لیجیے۔مثال کے طور پر ہم ''صَدَّقَ'' کے مقابلے میں تو ''کَذَّبَ'' کا لفظ صحیح معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن ''تَوَلّٰی'' کے مقابلے میں جو ''صَلّٰی'' ہے کہ یہ حقائقِ خداوندی کی تصدیق نہیں کرتا تھا' ان کی تکذیب کرتا تھا' اِدھر اُدھر منہ موڑ کے چل دیتا تھا' گریز کی راہیں نکالتا تھا تو پھر اس کے پیچھے کوئی ایسا لفظ آنا چاہیے جو اس کی ضد ہے' وہ تیسرا لفظ ''صلّٰی'' ہے کہ یہ سیدھے سیدھے راستے پہ' صراطِ مستقیم پہ نہیں چلتا تھا' گریز کی راہیں نکال کر اِدھر اُدھر مڑ جاتا تھا' تو بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ کچھ یہ کرتا تھا۔

یہ تکذیب کرنے والے کون ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ ''تکذیب'' اور ''تکفیر'' میں فرق کیا ہے؟ کفر تو یہ ہے کہ آؤٹ رائیٹ (Out right بالکل ہی) کسی چیز سے انکار کر دینا جیسے کہ میں مانتا ہی نہیں ہوں اور تکذیب یہ ہے کہ زبان سے کہتے رہنا کہ مانتا ہوں' کہتے چلے جانا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ' کائنات میں' دنیا میں' کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے خدا کے۔یہ کہتے چلے جانا ہے اور ہر دوسرے شخص کو خدا بناتے چلے جانا' زبان سے یہ کہتے چلے جانا عملاً یہ کرتے چلے جانا۔اسے تکذیب کہتے ہیں۔تصدیق یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

---

[1] صلوٰۃ کا مادہ ''ص ل و'' ہے۔

❷ لف ونشر

تکذیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے مضمرات

عزیزانِ من! یہ اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم منہ سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیں پھر مینار پہ کھڑے ہو کر لاؤڈ اسپیکروں کے ساتھ دنیا کو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیں۔ یہ تو عملی طور پر ثابت کرنا ہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں' اس معاملے کا میں گواہ ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی شخص صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اللہ اکبر! یہ کتنی بڑی گواہی ہے۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ سچ بول رہا ہے؟ کیا یہ اپنے اس اعلان کی تکذیب نہیں کر رہا؟ کیا کھڑے کھڑے' نیچے اتر کر' پوری زندگی میں' ہم میں سے ہر ایک' اس کی تکذیب نہیں کر رہا' انکار نہیں کرتا' یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے عملاً کچھ نہیں۔ جبکہ جو ہندو ہے اس کا یہ کہنا نہیں ہے۔ ہندو انکار کرتا ہے۔ وہ بھی یہ بات کہتا اور اسی طرح سیکولر والا انکار کرتا ہے۔ وہ بھی اس بات کو نہیں مانتا لیکن ہم ہیں کہ یہ الفاظ دہرائے چلے جا رہے ہیں اور عملاً انکار کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس کو تو تکذیب کہتے ہیں۔ صَدَّقَ کے مقابلے میں کَذَّبَ آیا ہے۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ وہ سیدھا اس راستے پر نہیں چلتا بلکہ گریز کی راہیں نکالتا چلا جاتا ہے' سارا روپیہ' جتنی دولت' جی چاہے جمع کر لو قرآن میں آیا ہے کہ یہ سب کے جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے لیکن اس کے باوجود یہ سارا کچھ کرتا چلا جاتا ہے' اس میں سے اتنے سے پیسے خیرات کر دیجیے باقی سب مال پاک ہے۔ یہ گریز کی راہیں ہیں' ثُمَّ ذَھَبَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ یَتَمَطّٰی (75:33) پھر بڑے فخر سے اپنے گھر کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بابا! یہاں تو تم نے عیش سامانیوں کا انتظام کر لیا ہے' آخرت میں بھی سوچو کہ کیا حشر ہوگا؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ ان سے کہے گا کہ کوئی بات نہیں ہے' میں نے وہاں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ ارے! کیا کر رکھا ہے؟ کہتا ہے کہ دیکھ لینا وہاں ہمیں یہاں سے بھی زیادہ بہتر مکان ملے گا کیونکہ جو شخص یہاں ایک مسجد بنا دے' اس کا موتیوں کا گھر وہاں بن جائے گا۔ یعنی جس طرح جی چاہے دولت جمع کر لو بس اس میں سے کچھ حصہ ڈال دیجیے تو اب یہ وہاں Secure (محفوظ) ہو گیا۔

عزیزانِ من! بقول ان کے' یہ وہاں کے انتظامات ہیں۔ یہاں یہ جو یَتَمَطّٰی (75:33) کا لفظ آیا ہے کہ وہ بڑے فخر سے اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے یعنی اُسے شرم نہیں آتی' ندامت نہیں ہے' اس کے برعکس اسے اس بات کے اوپر فخر ہے' کیا بات ہے صاحب! اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی o ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ❶ (75:34-35)۔ عزیزانِ من! قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ بڑے فخر سے اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے' مگر سمجھتا نہیں ہے کہ اس کے لیے تباہی ہے: یکسر تباہی' بالکل تباہی۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ اَیَحْسَبُ

---

❶ اے بدنصیب! تیرے لیے کس قدر بہتر تھا کہ تو قوانین خداوندی کا اتباع کرتا۔ اے کاش! یہ بات تیری سمجھ میں آ جاتی کہ وہ روش تیرے حق میں کس

قدر مفید تھی۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

اَلْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ❶ (75:36)۔اس آیت میں ''سدی'' کا لفظ بڑا عجیب لفظ ہے۔کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔اب ''سدی'' لفظ کے عام بنیادی معنی یہ ہوتے ہیں جسے ہم شتر بے مہار کہتے ہیں یعنی جس سے کوئی مواخذہ ہی نہ کیا جا سکے جس پہ کوئی گرفت ہی نہ کی جا سکے جس کو یونہی آوارہ چھوڑ دیا جا سکے۔

اس پوری کائنات کا اور انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے

قرآن کی رو سے کائنات کا اور بالخصوص انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے۔کائنات کا کیا مقصد ہے؟ وہ تو ہم نہیں جانتے مگر انسانی زندگی بالمقصد پیدا ہوئی ہے۔اقبالؒ (1877-1938) نے یہ بالکل صحیح کہا تھا کہ یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود۔ ❷ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا ایک Purpose (مقصد) ہے لائف (زندگی) کا ایک منتہیٰ ہے ایک نصب العین ہے۔جو چیز کسی مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہو وہ عبث نہیں ہوتی۔

اب عبث کا لفظ آیا ہے تو دیکھیے قرآنِ کریم نے ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا (23:115) کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے تم بلامقصد پیدا کیے گئے ہو تمہارا کوئی نصب العین نہیں ہے کوئی منزل نہیں ہے کوئی منتہیٰ نہیں ہے آوارگی ہے جدھر جی چاہے منہ اٹھا کے چلدو کوئی ایسی قوت نہیں ہے جو تمہیں اس نصب العین حیات کی طرف گھیر کر لے جائے کیا تمہیں بلامقصد پیدا کیا؟ یہاں عبث کا لفظ ہے اور کہا ہے کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت اور بلامقصد و منزل پیدا کر دیا ہے کہ اتفاقیہ دنیا میں آ گئے۔کچھ دن زندہ رہے۔پھر خاک میں مل گئے اور زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا! اس لیے جو کچھ تمہارا جی چاہے تم کرتے رہو۔تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

عزیزانِ من! وہ مقصد آخر میں ہے لیکن یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم سمجھ رہے ہو کہ کوئی پوچھنے والا نہیں کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں وَ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (23:115) اور تم پر ہمارے قانونِ مکافات کی کوئی گرفت ہی نہیں؟ تم سمجھے بیٹھے ہو کہ خدا کے ہاں کوئی

---

❶ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفر کی کوئی منزل متعین نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد وضوابط۔اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔اس تصورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبعی زندگی کی مفاد پرستیوں کا تانا بنتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات (Human Personality) کا بانا نہیں ڈالتا۔اس طرح اس کی ساری زندگی بلامقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہو جاتی ہے۔(حالانکہ زندگی مفادِ عاجلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے کپڑا بننے کا نام ہے۔یا یوں کہیے کہ زندگی عبارت ہے دنیا کے تانے میں دین کا بانا ڈالنے سے۔اگر دین اور دنیا روح اور مادہ مستقل اقدار اور امورِ تمدن و سیاست کا اس طرح امتزاج نہ ہو تو انسانی زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔قرآنی تعلیم انہی کا امتزاج سکھاتی ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔)(مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ اقبالؒ: جاوید کے نام در بالِ جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور 1996ء ص۔129:

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!

مواخذہ نہیں ہے' جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں' راوی عیش لکھتا ہے۔ پہلی چیز تو اس میں یہ کہی گئی ہے کہ مواخذہ ہوگا' تو پھر اس طرح سے لاپرواہی نہیں برتے گا۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے' صدق نہیں ہے؟ زبان سے کہتے ہو' عملاً اس کی تصدیق نہیں کرتے ہو۔

عربوں کی زبان میں لفظ ''سدی'' کا مفہوم

اگلا لفظ جو عرب استعمال کرتے تھے وہ ''سُدًی'' ہے۔ یہ لفظ تو اپنے اندر عظیم فلسفہ رکھتا ہے۔ عبث' بلامقصد! یہ کیا چیز ہے؟ یہ عجیب چیز ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ عرب اَن پڑھ قوم تھی۔ مکے جیسا ان کا ام القریٰ (Capital City) مرکز تھا۔ یہ سب کچھ' یہ تجارت کا' یہ قافلوں کے آنے جانے والوں کا' کعبے کی وجہ سے تھا اور مکے جیسے شہر میں صرف سترہ آدمی وہ تھے جو صرف نوشت وخواند جانتے تھے' تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ صرف لکھنا پڑھنا تھا۔ اس دَور کو عہدِ جاہلیہ کہا جاتا تھا۔ واقعی یہ پورے کا پورا ملک بڑا تاریک تھا۔ اس میں یہ قوم تھی۔ یہ اُس قوم کی اُس زمانے کی زبان بنی ہوئی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے یہ اتنے بڑے بلند معنی کہاں سے سیکھے' ان کے ذہن کے اندر یہ معنی کہاں سے آئے۔ جو عبث اور بے کار کام ہے' وہ ''سُدًی'' ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں کے یہ جو الفاظ ہیں اور ان الفاظ کے یہ جو مادے (Roots) ہیں' یہ عرب ان مادوں کو جس طرح استعمال کرتے تھے اگر وہ چیزیں آپ کے سامنے آجائیں تو قرآن کے معنی نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

وہ سُدًی کو کیسے استعمال کرتے تھے؟ بات تو یہ ہے۔ عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے کہ کوئی ایسا کام ہو جو نتیجہ خیز نہ ہو' کوئی نتیجہ پیدا نہ کرے' مگر اس میں آدمی لگا رہے۔ عزیزانِ من! آپ ذرا ان شرائط کو سامنے رکھیے کہ تگ و دو' بھاگ دوڑ' سعی و کاوش' یہ سب ہو مگر اس کا نتیجہ کوئی نہ ہو تو وہ اسے کیسے سمجھاتے؟ ہم نے تو یہاں اب شہر میں اور شہر والوں نے جولاہا بہت کم دیکھا ہوگا' وہ ایک تانی تنتا ہے۔ اس کے ہاں ایک تانا ہوتا ہے۔ وہ جو سیدھا دھاگے لے جاتے ہیں وہ تانا ہوتا ہے اور ایک بانا ہوتا ہے۔ جو آگے اس طرح سے اس تانے سے گزار کر لے جاتے ہیں۔ یہ دونوں تانا اور بانا کہلاتے ہیں۔ یہ تانا اور بانا اکٹھے ہوں تو پھر یہ ''ثوب''[1] بنتا ہے یعنی کپڑا بنتا ہے' پھر وہ ''ثواب'' ہوتا ہے۔ اگر تانا ہی تانا رہے' جولاہا ساری عمر لگا رہے وہ تانا ہی تانا تنتا چلا جائے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ[2] ہے۔ تگ و تاز ہو رہی ہے' سعی و کاوش ہو رہی ہے' محنت ہو رہی ہے' ساری عمر بھی لگا رہے تو بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور اگر کوئی دوسری طرف بانا ہی بانا بنتا رہے' پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ سیکولر زندگی ہو' مادی زندگی ہو' صرف دنیاوی زندگی ہو' اس کے اندر اقدارِ خداوندی کا بانا نہ ہو' تو وہ تانا ہی تانا رہے گا۔ خانقاہیت کی زندگی ہو' آپ کے ہاں کی یہ شرعی رسومات کی اور شعائر کی زندگی ہو' یہ بانا ہی بانا ہوگا' اس میں

---

[1] کپڑا

[2]

❷ ان کے اعمال رائیگاں گئے۔

تانا نہیں ہے۔ اِدھر بانا نہیں ہے‘ تانا ہے۔ اُدھر بانا ہے تانا نہیں۔ یہ ساری عمر بانے میں لگے رہے‘ وہ تانے میں لگے رہیں تو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ [1] ہوا۔ وہ بھی گیا یہ بھی گیا۔ ایک لفظ ’’سدی‘‘ نے یہ سب کچھ بتا دیا۔ زندگی ان دونوں (تانا اور بانا) کے امتزاج کا نام ہے۔ سچ کہا تھا مفکرِ قرآن اقبالؒ (1877-1938) نے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے ‘ تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ شخص بھی کیا بات کہہ جاتا ہے!

خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے

دین‘ مذہب نہیں ہے۔ مذہب تو نرا تانا ہی تانا ہوتا ہے۔ یہ خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے۔ یہ جسے روحانیت کہتے ہیں یہ فریبِ نفس ہے۔ یہ Mechanically (میکانکی طور پر) رسمی طور پر‘ مذہب کے جتنے بھی شعائر ادا کرتی ہے‘ رسمی طور پر Mechanically فرائض ادا کرنے والی بات ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ بھی تانا ہی تانا ہے۔ دوسری طرف زندگی کا مقصود صرف اس طبعی زندگی کے اسباب و سامان کو اکٹھا کرتے چلے جانا اور ان میں قدرِ خداوندی کو نہ لانا‘ بانا ہی بانا ہے‘ اس میں ان قدار کا تانا نہیں ہے جبکہ زندگی ان دونوں کے امتزاج کا نام ہے: دین اور دنیا کا امتزاج‘ عاجلہ اور آخرۃ کا امتزاج۔ ان الفاظ میں تو میں روحانی کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتا۔ وہ تو پھر اسی تانے کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان کے لیے تو میں اقدار کہا کرتا ہوں۔ وہ صحیح لفظ ہیں۔ اس کی Values (اقدار) ساتھ ہونی چاہئیں‘ یہ دونوں چیزیں اکٹھی کی جائیں تو پھر دین بنتا ہے۔ یعنی تانا اور بانا اکٹھا کیا جائے۔ اس قوم کی کیا بات ہے! اسی تانے اور بانے کے ملنے سے انہوں نے ثوب کا لفظ استعمال کیا کہ کپڑا (ثوب) بنتا ہے اور اس ’’ثوب‘‘ سے کہا کہ اگر ایسا کیا جائے تو کام کا ’’ثواب‘‘ ہوتا ہے‘ نہ کیا جائے تو پھر ثواب نہیں ہوتا۔ کسی کے پاس تانا ہوتا ہے‘ کسی کے پاس بانا ہوتا ہے‘ دونوں فریب میں مبتلا! ہوتے ہیں کہ بڑا کام کر رہے ہیں۔

جولاہی تانا تندی پھر دی اے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا ہے ہمارے ہاں یہ جو کھڈی پر تانا اور بانا ہوتا ہے‘ اس سے پہلی ایک منزل ہوتی ہے۔ یہ سوت یعنی تاگے جولاہے کو دیئے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں وہ سوت کے تاگے لپٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی پہلی منزل یہ ہوتی تھی کہ عام طور پہ راستے ہی میں وہ‘ یہاں سے وہاں تک‘ کانے [2] کی کچھ لکڑیاں سی کھڑی کرتے اور اس تاگے کو یہاں سے وہاں تک لے جاتے اور لے

---

[1] ان کے اعمال رائیگاں گئے۔

❷ سرکنڈا

آتے تھے۔ عام طور پر ان کی عورتیں یہ کیا کرتی تھیں۔ وہ عورتیں تاگے کو ادھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر لیے پھرتی تھیں' وہ دن بھر چلتی رہتی تھیں۔ وہ اس کو ایک ابتدائی شکل دینے کی صورت ہوتی تھی' لیکن اتنی سی چیز جتنی وہ کر رہی ہوتی تھیں اگر اسی کو وہاں چھوڑ دیا جائے تو بے معنی ہوتا تھا۔ اس پر ہمارے ہاں پنجابی میں' ایک محاورہ ہوتا تھا کہ جو اس طرح سے دوڑ دھوپ تو بہت کرے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے تو کہا کرتے تھے کہ ''جولاہی تانا تندی پھر دی اے'' یعنی وہ یہ چیز ہے کہ اس میں بانا نہیں آ کے ڈالتا' تانے کی ساری محنت بے کار چلی جاتی ہے۔ یہ ہے: اُولٰئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ یعنی ان کے اعمال رائیگاں چلے گئے۔

یہاں کہا کہ انسان سمجھتا یہ ہے کہ اس سے کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں ہے اور زندگی کے اعمال کی کیفیت یہ ہے کہ ساری عمر تانا تنتا رہتا ہے اور ذہن میں یہ تصور ہے کہ میں بہت اچھا کپڑا بن رہا ہوں۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ زندگی کے اس امتزاج سے ان دو چیزوں کے امتزاج کا ایک محسوس نتیجہ مرتب ہوگا۔ جب تانا اور بانا دونوں ساتھ ہوں گے یعنی مادی دنیا کے اسباب و ذرائع کے لیے یہ تمام ذرائع اور قوتیں بطور تانا اور اقدار خداوندی بطور بانا ڈالے گا تو زندگی کا مقصد پورا ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ❶ (75:36)۔ آپ نے اب غور فرمایا ایک لفظ میں قرآن بات کتنی بڑی کہتا ہے۔ اس لفظ ''سدی'' کے اندر ساری دنیا کا فلسفہ آ جاتا ہے۔

جہانِ فردا کی حقیقت

اب رہی یہی بات کہ کیا اس کے بعد پھر دوسری زندگی بھی ہوگی؟ یہ پیچھے سورۃ (75:3) میں بھی آ چکا ہے کہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب انسان مر مرا جائے گا' ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں' خاک میں مل جائیں گے' گوشت کو کیڑے کھا جائیں گے' یہ راکھ کے ساتھ راکھ ہو جائیں گی' تو اس کے بعد انسان کو زندگی کیسے ملے گی؟ قرآن نے ایک تو یہ کہا کہ اس زندگی کے متعلق تم ذہن میں نہیں لا سکتے کہ وہ کیسی ہوگی لیکن اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ جب انسان کے جسم میں سے کوئی چیز اس طرح باقی نہ رہے تو پھر بھی اس کو پیدا کیا جائے۔ قرآن اس قسم کی ایک دلیل دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ لَا بُرْهَانَ لَهٗ (23:117) اس کا تو ان کے پاس

---

❶ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفر کی کوئی منزل متعین' نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد و ضوابط۔ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ اس تصور حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبعی زندگی کی مفاد پرستیوں کا تانا بنتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات (Human Personality) کا بانا نہیں ڈالتا۔ اس طرح اس کی ساری زندگی بلا مقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہو جاتی ہے۔ (حالانکہ زندگی' مفاد عاجلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے کپڑا بننے کا نام ہے۔ یا یوں کہیے کہ زندگی عبارت ہے دنیا کے تانے میں دین کا بانا ڈالنے سے۔ اگر دین اور دنیا' روح اور مادہ' مستقل اقدار اور امور تمدن و سیاست کا اس طرح امتزاج نہ ہو تو انسانی زندگی کا

مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔قرآنی تعلیم انہی کا امتزاج سکھاتی ہےاور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔)(مفہوم القرآن ۔پرویز)

نہیں ہوسکتا جب ہم دلیل دیتے ہیں۔ کہا کہ مرنے کے بعد پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا یہ کچھ ہے تو سہی' وہ مٹی میں ملا ہوا سہی' وہ کیڑوں نے ہی کھایا ہوا سہی' پھر بھی کوئی نہ کوئی وجود تو ہے ہی۔ اس کے برعکس یہ ساری کائنات جو پیدا ہوئی ہے' وہ تو عدم سے وجود میں آئی ہے' جہاں کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ یہ ساری کائنات تمہارے سامنے ہے اور تم کھڑے ہو۔تمہارا سب سے بڑا سائنسدان بھی یہ کہتا ہے کہ ہم اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ Nothingness(عدم) سے Being(موجود) کیسے ہوگئی' کیسے عدم سے وجود میں آ گئی جبکہ کچھ نہ تھا؟ یہ بڑی صحیح بات ہے کہ یہ جو عالم اسباب ہے' یہ جو فزیکل کائنات ہے' اس Nature(فطرت) میں مختلف چیزیں موجود ہیں' وہ Elements(عناصر) کی شکل میں ہی سہی' وہ موجود تو ہیں۔کوئی سائنسدان نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس طرح عدم سے وجود میں آئیں۔ آگے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تخلیق ہے۔

خلق کے معنی ہوتا ہے ''مختلف چیزوں کو خاص تناسب کے ساتھ اکٹھا کر کے ایک 'نئی چیز' بنا دینا۔'' یہ 'نئی چیز' عدم سے وجود میں لانے کی نہیں ہے۔ جو چیزیں موجود ہیں' یہ انہی میں مختلف تناسب سے' مختلف توازن سے' کچھ اختلاف پیدا کر کے' ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ سارا کچھ یہی ہے۔ یہ جتنا کچھ بھی یہ سائنسدان ہمارے ہاں کرتے ہیں' یہ جو بھی صنعت و حرفت ہوتی ہے' وہ موجود چیزوں کو ترتیب نو دے کر ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ تخلیق ہے' یہ عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے۔

بصارت کو بصیرت میں بدل دینے والی دلیل

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ کچھ تو تمہاری سمجھ میں آیا ہے۔ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ چیزیں جن کی ترتیب سے تم تخلیق نو کرتے ہو' یہ بذاتِ خود کہاں سے آ گئیں؟ کوئی ایسا Element(عنصر) اس سے پہلے نہیں تھا کہ جن سے یہ وجود میں آئی ہیں۔تو جو خدا اس طرح سے اتنی عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے' کیا وہ ایک انسان کو از سر نو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر دلیل کی رو سے سمجھنا چاہتے ہو تو یہ کتنی محکم دلیل ہے۔اب اس کے بعد آ گلی آیت میں کہا کہ اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی [1] (75:37)۔اپنی پیدائش پہ غور کیجیے۔انسان یا انسانی بچہ یا جو کچھ بھی یہ انسان اب ہے' کیا یہ تمہارے ذہن میں آ سکتا تھا کہ یہ ایک ابتدائی مادہ تولید سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ Scientist(سائنسدان) یا ڈاکٹر وغیرہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا مادہ تولید سے ہوئی۔ اس ایک قطرے میں کروڑوں جرثومے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے اتنے بچے بن سکتے ہیں۔ یہ جرثومے کیسے پیدا ہوتے ہیں' غور طلب ہے۔تخلیق انسانی کی ابتداء (Conception) میں' جس سے یہ تخلیق آگے چلتی ہے' دو جرثومے [2] اکٹھے ہوتے ہیں: نر کا تولیدی جرثومہ مادہ کا (تولیدی جرثومہ:

---

[1] اسے سوچنا چاہیے کہ حیاتِ انسانی' کتنے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔وہ ایک قطرۂ آب تھا جو رحم میں گرایا گیا۔(مفہوم القرآن ۔پرویز)

❷ Sperm (نر کا تولیدی مادہ) اور Qvum (عورت کا مادۂ تولید)

بیضہ خلیہ) یعنی عورت کا اور مرد کا (تولیدی Reproductive) جرثومہ اکٹھے ہوتے ہیں تو تخلیق انسانی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جرثومے کہاں سے آئے؟ پھر کہا کہ یہ کہیں سے بھی آئے' کیا اس کا کوئی جرثومہ مائیکروسکوپ (خوردبین :Microscope) کے بغیر اندر سے نظر آتا ہے؟ وہ تو ایسا ہوتا ہی نہیں ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک چھوٹا سا انسان ہوتا ہے' وہاں وہ بونا سا ہوتا ہے' بالکل نہیں۔ اُسے تو سوئی کے ناکے جتنا ایک ذرا سا نقطہ سمجھ لیجیے۔ وہ بس یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر اس اکیلے کو دکھا کر کسی سے کہا جائے کہ اس کے اندر تمہارا باپ چھپا بیٹھا تھا تو اس بات کو کوئی نہیں مانے گا حالانکہ وہ اسی کے اندر تھا۔ ہر بیج کے اندر تناور درخت ہوتا ہے۔ ہر اس جرثومہ تناسل کے اندر انسان کا بچہ بیٹھا ہوتا ہے' پورا انسان ہوتا ہے۔ کہا کہ وہاں سے تو یہ بات شروع ہوئی کہ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً (75:38) پھر وہ ذرا لوتھڑا سا' چپکنے والا' کچھ بن گیا۔ قرآن نے' دیگر مقامات میں انسانی بچے کی رحم کے اندر جو Stages (مراحل) ہیں' انہیں بھی گنایا ہے اور اسی لیے گنایا ہے کہ ذرا دیکھتے چلے جاؤ۔ کیا تم تصور میں لا سکتے ہو کہ اس سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ کچھ وہاں ہوگا؟ اب اس نے وہ ذرا سی محسوس شکل اختیار کی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ فَخَلَقَ (75:38)۔ اب یہاں لفظ خلق آیا۔ خلق کے آگے فَسَوّٰى ❶ (75:38) آیا۔ اب اس میں تناسب پیدا ہوا۔ وہ گوشت کا ایک لوتھڑا سا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے اندر یہ سارا تناسب ہے: سر ہے' آنکھیں ہیں' یہ بازو ہیں' یہ ٹانگیں ہیں' یہ انگلیاں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ عزیزانِ من! ''سوی'' کہتے ہیں: حشو و زوائد کو' فالتو چیزوں کو' اِدھر اُدھر چھانٹ کر' الگ کر کے' اس میں سے ایک مجسمہ کھڑا کرنا۔ یاد رکھیے! خدا کی ایک صفت المُصَوِّر بھی ہے۔ یہ صفت کے مطابق ایک مجسمہ کھڑا کرنا ہے۔

کمہار کے عمل کی مثال

عزیزانِ من! اس کی ایک مثال کمہار کے عمل کی ہے۔ وہ کمہار اپنے اس پہیے کے اوپر' مٹی کا اتنا بڑا اتوا سا لوتھڑا سا' ڈالتا ہے۔ اس پہیے کو گھماتا ہے تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ جتنی زائد مٹی ہوتی ہے' اُسے الگ کر کے' ایک نئی چیز بنا لیتا ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ وہ کمہار بڑا ہنرمند ہوتا ہے۔ اس کے یہی دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ اس کے پاس ایک تاگا ہوتا ہے' تھوڑا سا پانی ہوتا ہے۔ وہ اس کو کچھ یوں کرتا چلا جاتا ہے اور مٹی کو اِدھر اُدھر الگ کرتا چلا جاتا ہے' اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے آبخورہ بن گیا' صراحی بن گئی' کسی کا یہ بن گیا اور کسی کا وہ۔ یہ المُصَوِّر ہے۔ یہ جو حشو و زوائد کو الگ کر کے' صحیح تناسب سے' ایک چیز کو پیدا کر دینے کا عمل ہے' تسویہ کہلاتا ہے۔ یہاں قرآن 'فسوّٰی'' کہتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ پھر یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔ تم میں سے کوئی یہ کچھ نہیں کر رہا ہوتا' نہ اس بچے کا باپ کر رہا ہوتا ہے' نہ اس بچے کی ماں کر رہی ہوتی ہے' نہ وہاں کوئی مشینری لگی ہوئی ہے جو یہ کچھ کر رہی ہے' نہ وہاں خرادلگا ہوا ہے جو

---

❶ بعدازاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہوا۔

یہ کچھ کرے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ یہ قانونِ خداوندی ہے جس کی رو سے یہ ہو رہا ہے اور پھر اگلی ہی آیت میں کہا کہ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ❶ (76:39)۔ وہ ایک ہی قسم کا نہیں پیدا ہو جاتا۔ پھر اس میں نر اور مادے کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ دونوں کے طبعی وظائف ہوتے ہیں یعنی یہ جو دونوں کے جسم کے وظائف اور چیزیں ہوتی ہیں وہ اسی جرثومے سے کچھ الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ کہا کہ صرف اتنی سی چیز پہ ہی غور کرو۔ اس کے بعد کہا کہ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (76:40) کیا یہ کچھ کر لینے والا جو خدا کا قانون ہے' وہ اس پہ قادر نہیں ہے کہ وہ انسان کو پھر زندہ کر دے؟ کیا بات ہے کہ سمجھانے کے لیے دلیل کیا کیا دی ہے! بات تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' زندگی آگے چلتی ہے۔ آگے جو زندگی ہے' اس کا دارومدار اُن اعمال پہ ہے جو انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ یہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھنا ہے یا وہیں رک کر کھڑے ہو جانا ہے۔ اس رک کر کھڑے ہو جانے کو جہنم یا جحیم کہا جاتا ہے۔ اِس تصورِ حیات کے لیے راستے میں یہی چیز مانع تھی جو یہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! ہم انسان کو دبا دیتے ہیں' اس کو مٹی کھا جاتی ہے' جلا دیتے ہیں' پانی میں گرتا ہے' مچھلیاں کھا جاتی ہیں تو اس کے بعد کس طرح سے کوئی چیز وجود میں آ سکتی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ ختم ہو گیا۔

کوئی مادہ ❷ ختم نہیں ہوتا

قرآن یہی سمجھاتا ہے کہ تم خود اپنے سائنسدانوں سے پوچھو کہ کیا یہ چیز ختم ہو جاتی ہے؟ سائنسدان تو یہ کہتے ہیں کہ جو Matter (مادہ) ہے' یہ کبھی ختم ہوتا ہی نہیں۔ ''ختم نہیں ہوتا'' کے معنی ہیں کہ اس کا عدم نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کی Existence (وجود) ختم ہو جائے۔ وہ شکلیں بدلتا ہے' وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شکلیں ہی بدلتا ہے۔ تو کیا جس نے ایک جرثومے کی شکل بدل کر' ایک تندرست و توانا بچے کی ہیئت میں پیدا کیا' پھر وہ انسان اتنا بڑا بن گیا' کیا اس طرح شکلیں بدلنے والا خدا کا قانون یہ نہیں کر سکتا کہ جسے تم کہتے ہو' انسان مر گیا' وہ انسان زندہ ہو جائے۔ اگرچہ دوسرے مقامات پہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ اس قسم کا انسان اسی شکل کا ہو گا یا کچھ اور ہو گا۔ نہیں' کچھ نہیں' تمہارا یہ شعور ابھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کا ہو گا لیکن یہ سمجھو کہ اس کے بعد وہ زندگی ہے' وہ Individual (فرد) ہے' وہ ہر فرد کی انفرادی زندگی ہے۔ ہر فرد کو اس کا احساس ہو گا کہ میں نے پہلی زندگی بسر کی ہے' وہ اپنے اعمالنامے کو دیکھ کر پہچانے گا کہ اُس میں یہ یہ کچھ اُس نے کیا ہے۔

---

❶ اس میں جنسی تفریق سے مرد اور عورت کے جوڑے بنے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

Matter ❷

سب سے بڑا جہنم

عزیزانِ من! اسے نہ بھولیے جو میں کہا کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ جہنم تو یہ ہوگا جو قرآن کہتا ہے کہ وہاں تم بھی ہوگے' جن لوگوں میں تم نے یہاں زندگی بسر کی ہوگی' کسی کو فریب دے کر بسر کی ہوگی' کسی سے منافقت برتی ہوگی' کسی سے جھوٹ بولا ہوگا' اور بڑے کاریگر معتبر بن کر وہاں سے چلے آ رہے ہوگے' یہاں آؤ گے تو یہ ساری چیزیں بے نقاب ہونگی' اور وہ سارے تمہارے سامنے کھڑے ہونگے۔ اف! جن کے سامنے یہاں آدمی معتبر بننے کی کوشش کرتا ہے' ایک جگہ جھوٹ بول کے کہ کہیں میرا یہ جھوٹ بے نقاب نہ ہو جائے' کسی طرح بات نہ کھل جائے' یہاں یہ کیفیت ہے کہ سب کچھ سامنے ہوگا۔ وہاں صورت یہ ہوگی کہ تم ہوگے اور یہ سب ہونگے اور یہ سب کچھ جو لکھا ہوا ان کے سامنے آئے گا کہ دل میں اس کے یہ تھا' کہہ تمہیں یہ رہا تھا۔ وہ پوچھیں گے کہ کیوں حضرت صاحب! وہاں تو بڑے مقدس اور معتبر بنے بیٹھے تھے' اور حالت آپ کی یہ تھی۔ اور پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ کسی قسم کی کوئی بہانہ سازی اور عذر وہاں کام نہیں دے سکے گا' حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔ سب سے بڑا جہنم تو وہ ہے' عزیزانِ من! تو یہ ہے قرآن کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ کہ تمہارا ہر عمل' ہر کام' ہر آرزو' اور ہر ارادہ تک اپنا نتیجہ' محسوس نتیجہ برآمد کر کے رہے گا۔ یہاں نہیں تو اگلی زندگی میں سہی اور یہ قرآن کی ساری تعلیم کا ملخص ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ' آج اس آیت پر ختم ہوگئی۔ آئندہ ہم سورۃ الدھر لیں گے۔ یہ 76 ویں سورۃ ہے اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ سے شروع ہوتی ہے۔ کیا بات ہے کہ یہ پچھلی آیت کے تسلسل میں ہی یہ چیز آ رہی ہے۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ❶ (76:1)۔ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ یہ انسان اس قابل بھی نہیں تھا کہ اس کے متعلق تم کوئی لفظ بھی استعمال کر سکو۔ تمہارے پاس ڈکشنری کے اندر کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو بتا سکو کہ اس سے پہلے یہ کیا تھا۔ جسے تم Non-existence (عدم) کہہ دیتے ہو' صرف عدم کہہ دیتے ہو' موجود نہیں ہے کہہ دیتے ہو' یہ کیا تھا؟ تم نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❁ ..... ❁ ❁ ❁ ..... ❁

---

❶ یہ حقیقت ہے کہ انسان (جو اس وقت پیکر بشریت میں موجود ہے) اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کوئی شے نہ تھا جو از خود موجود ہوتی۔ (پھر ہم